۱۳۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اردو، ترتیب و تدوین مع اضافات: محمد اکرم چغتائی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۴۳

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اول، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۳ء، ص:۳۰۰

☆.....☆.....☆

مجید امجد کی نظم نگاری۔۔۔ایک مطالعہ

صائمہ اقبال

Saima Iqbal

Lecturer, Department of Urdu

Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

(June29, 1914 - May11, 1974) was an acclaimed Urdu(مجید امجد) Majeed amjid (Urdu: poet from Pakistan .In popular culture Amjid,s poetry readers are less than Faiz Ahmad Faiz,Noon meem Rashid,Nasir Kazmi or Meeraji but amongst many critics he is regarded as a "philosophical poet of depth and sensitivity" Amjid,s first collection of poetry, Shab-e-Rafta, was published in 1958 for which he wrote a preface in verse.In 1976 second addition was published by titled Shab-e Rafta ke Baad.Amjid experimented with metrical forms and rhythms. His vocabulary was eclectic. A cursory examination of his poems will reveal a matrix carefully peppered with a regional register of words.He mada his own distinctive.He left behind folders full of poems, letters and musings.

مجید امجد کی نظم نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو کرداروں کے طلسم سے نجات دلا کر حالات و واقعات کی دلکش کیفیات سے آشنا کیا۔ وہ اپنے احساسات کو اس قدر دلنشیں انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ان کی شاعری ندرت تخیل کا حسین نمونہ بن جاتی ہے۔ تخلیقی اظہار کو جس قوت اور آب و تاب کے ساتھ مجید امجد نے اپنی نظموں میں پیش کیا ہے وہ انہیں منفرد مقام پر فائز کرتا ہے۔

مجید امجد کی وہ نظمیں جن کا تعلق ابتدائی دور سے ہے ان پر نادر کاکوروی اور اختر شیرانی کے اثرات نمایاں ہیں۔ شروع میں انہوں نے پابند نظموں پر توجہ دی۔ ۱۹۳۴ء اور ۱۹۴۲ء تک ان کا کلام روزنامہ ''عروج'' جھنگ میں شائع ہوا وہ زیادہ تر پابند نظموں پر مشتمل تھا۔ ان کی پہلی نظم ''حسن'' ۱۹۳۴ء میں جوش ملیح آبادی کے مجلّے ''کلیم'' میں شائع ہوئی۔ تخلیق فن کے لمحوں میں مجید امجد نے جذبات و احساسات کو جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے وہ روح کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں۔

اردو میں آزاد نظم کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ن۔م راشد کا شعری مجموعہ ''ماوراء'' جو آزاد نظموں پر مشتمل تھا، ۱۹۴۱ء میں منظر عام پر آیا۔ تصدق حسین خالد کا آزاد نظموں پر مشتمل شعری مجموعہ ''سرودنو'' ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ مجید امجد کا پہلا شعری مجموعہ ''شب رفتہ'' ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس لحاظ سے دیکھیں تو مجید امجد اگرچہ بہت پہلے سے آزاد نظم لکھ رہے تھے مگر کتاب کی اشاعت

میں غیر معمولی تاخیر نے انہیں اس شہرت سے محروم رکھا جو ان کے معاصر شعراء کے حصے میں آئی۔ ''شب رفتہ'' کی نظمیں موضوع اور مواد کے اعتبار سے جس پذیرائی کی مستحق تھیں وہ انہیں نصیب نہ ہو سکی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مجید امجد کے معاصر شعراء جن میں ن۔م راشد، میراجی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان اور تصدق حسین خالد شامل ہیں اس سرعت کے ساتھ تخلیقی عمل میں مصروف رہے کہ ان کا نام اور تخلیقی کام عام قاری تک مسلسل پہنچتا رہا۔ مجید امجد چونکہ ذرائع ابلاغ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور ان کا کلام زیادہ تر جھنگ کے ایک نسبتاً محدود اور کم معروف اخبار میں شائع ہوتا رہا اس لیے انہیں ملک گیر شہرت نصیب نہ ہو سکی اور ان کا نام بڑی دیر تک غیر معروف رہا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی نظم ''حسن'' جو مجلّہ ''کلیم'' میں ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی ایک طویل عرصے تک اہل علم کی نظروں سے اوجھل رہی۔ یہاں تک کی چوبیس سال بعد ''شب رفتہ'' کی اشاعت کے بعد اسے زبردست پذیرائی نصیب ہوئی۔ لہجے اور اسلوب کی جدت نے شب رفتہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ مجید امجد نے اپنی تخلیقات میں اپنی تمام خداداد صلاحیتوں اور تخلیقی فعالیت کو مرکوز کر دیا ہے۔

مقبرہ جہانگیر

مرمریں قبر کے اندر۔۔تہہ ظُلمات کہیں
تُم نے دیکھا کہ نہیں ، آج بھی ان محلوں میں
کرمک و مور کے جبڑوں میں سلاطین کے بدن!
قہقہے جشن مناتے ہوئے نادانوں کے
کوئی دیکھے ، کوئی سمجھے تو اس ایواں میں جہاں
جب کسی ٹوٹتی محراب سے ٹکراتے ہیں
نور ہے، حسن ہے، تزئین ہے، زیبائش ہے
مرقد شاہ کے مینار لرز جاتے ہیں
ہے تو بس ایک بجھی روح کی گنجائش ہے(۱)

مجید امجد نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا مطالعہ زندگی کی حقیقی معنونیت کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ قومیں زوال پذیر ہو سکتی ہیں مگر تہذیب بہر حال زوال سے نا آشنا ہے۔ ہر دور میں تہذیبی ورثہ نئی نسل کو منتقل ہوتا ہے۔ نسلِ نو پر یہ بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وُہ تہذیبی میراث کے تحفظ کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کرے۔ غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل ہلاکت خیزی کا باعث بن سکتا ہے۔ کروچے نے کہا تھا:

''ماضی اپنے پیچھے نشانیاں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ نشانیاں محض بے حس
ٹکڑے نہیں ہوتے ان میں ماضی کے افکار چھپے ہوتے ہیں۔ یہ

ماضی کے ذہن وشعور کی عکاسی کرتے ہیں اور ہم ان نشانیوں کو اس
لیے محفوظ رکھتے ہیں تا کہ یہ مستقبل کے مورخ کے لیے ثبوت کے
طور پر فراہم ہوں۔''(۲)

مجید امجد کو اپنی تاریخ سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے لئے فکری بیداری کے خواہاں تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ مفلوک الحال طبقہ ظالم وسفاک استحصالی عناصر کے مکر کی چالوں سے محفوظ رہے۔ انہیں اس بات کا دکھ تھا کہ محنت کش دہقان جو ہڈیاں سینچ کے پھلواریاں مہکانے میں مصروف ہیں ان کی محنت کا صلہ انہیں نہیں ملتا۔ گھاس کٹتی ہے اور ان کے دن کٹے جاتے ہیں۔ غربت اور افلاس کی چکی میں پسنے والے محروم طبقات کی زندگی سفاک ظلمتوں کی بھینٹ چڑھ گئی ہے۔ دوستی اور دشمنی کے رنگ اور روپ یکسر بدل گئے ہیں۔ اس دنیا میں کوئی کسی کا پرسان حال نہیں۔ زندگی کے دکھوں کا مداوا ہو تو کیسے ہو؟

مجید امجد نے زندگی کی اقدار عالیہ کی سر بلندی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا۔ قحط الرجال کے موجودہ زمانے میں انسان شناسی کا جو اعلیٰ معیار مجید امجد کے ہاں نظر آتا ہے وہ قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ طبقاتی کشمکش کے باعث معاشرہ سکون اور راحت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ کسی کے فرق ناز پہ تاج ہے تو کسی کے دوشِ غم پر گلیم ہے۔ مجید امجد کی نظموں میں موضوعات اور مواد کا تعلق اجتماعی کیفیات سے ہے مگر اُن کے منفرد اسلوب نے اسے آفاقیت سے ہم کنار کر دیا ہے۔

سفر درد

اک زندگی کراہتے لمحوں میں ڈھل گئی
اک شمع موجِ اشک پہ بجھ بجھ کے جل گئی
اک بے گنہ پہ ظلم کی شمشیر چل گئی
ہے بھی یہاں غریب کی ہستی کا کوئی مول
میں پوچھتا ہوں ، مدعی عدل ، کچھ تو بول(۳)

گہرے سروں میں نوائے حیات عرض کرنے کے لیے سینے پہ ایک درد کی سل کا ہونا ضروری ہے، مجید امجد نے نشاطِ زیست کی کشمکش کا احوال اس دردمندی سے بیان کیا ہے کہ قاری ان کے جذبات، احساسات اور منفرد نوعیت کے تجربات کے بارے میں کسی ابہام کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کارگہ ہستی میں مرنے کا قصد اور جینے کا عزم ایک ساتھ کرنا ہی جہد للبقا کا تقاضا ہے۔ اپنی سوچ کی بے حرف ''لو'' کو فروزاں رکھنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ مجید امجد نے زینہ ایام کے نشیب پر عصا رکھتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرنے کی منفرد مثال پیش کی۔ ان کی نظمیں ان کی قلبی واردات کی عکاس ہیں۔ ان نظموں کی اثر آفرینی قاری کی روح میں اتر جاتی ہے۔ وطن اور اہل وطن سے قلبی وابستگی مجید امجد

کی نظموں کا خاص وصف ہے۔ جب بھی وطن پر کوئی مشکل وقت آیا انہوں نے اپنی تخلیقی فعالیت کے اعجاز سے عوامی شعور و آگہی کو مثبت انداز میں مہمیز کیا۔ ملک کے حالات سے جو براہ راست اثرات قبول کیے انہیں اشعار کے قالب میں ڈھالنے میں انہوں نے کبھی تامل نہیں کیا۔ انہوں نے قومی موضوعات پر لکھتے ہوئے اپنی تخلیقات کو اجتماعی صورت عطا کر دی ہے:

اے قوم
پھولوں میں سانس لے کے برستے بموں میں جی
اب اپنی زندگی کے مقدس غموں میں جی
وہ مائیں جن کے لال لہو میں نہا گئے
صدیوں اب اُن کے آنسوؤں، اکھڑے دموں میں جی
جب تک نہ تیری فتح کی فجریں طلوع ہوں
بارود سے اٹی ہوئی ان شبنموں میں جی(۴)

۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں ہمیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت کے حالات ہماری قومی تاریخ کا ایک خونچکاں باب ہیں۔ ہمارے نوے ہزار کے قریب فوجی جنگی قیدی بنا لئے گئے۔ مجید امجد کی نظم ''ریڈیو پر اک جنگی قیدی'' ان کی حب الوطنی اور قومی دردمندی کی مظہر ہے۔ اسی طرح ''توسیع شہر'' میں انہوں نے درختوں کے بے دریغ کاٹنے پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔ درخت تو دراصل ایک علامت ہے جو نفسیاتی کُل کی صورت میں قاری کے لاشعور کو صورت پذیر کرتی ہے۔ مجید امجد نے ہمیشہ حریت فکر کا علم بلند رکھا ہے اور جبر کا ہر انداز مسترد کر دیا ۔ انسانیت کی درخشاں اقدار کی سربلندی انھیں بے حد عزیز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ناانصافی اور جبر کے ماحول کو مقتل سے تعبیر کرتے ہوئے کہا:

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال
مجھ پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل

ہلاکت خیزیوں کے اس زمانے میں مجید امجد نے مسائل زیست کا نہایت سنجیدگی سے جائزہ لیا۔ بے حسی کا عفریت ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔ زندگی کی بے توقیری اور فرد کی بے چہرگی کی اعصاب شکن کیفیات تخلیق کار پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ مجید امجد نے ادعوارض کے اسباب معلوم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ انھوں نے اپنی قومی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ تاریخی شعور کو اس طرح اُجاگر کیا جائے کہ دلوں کو مرکز مہر و وفا کر دیا جائے مگر اُن کی یہ آرزو مپوری نہ ہو سکی۔ مادی دور کی لعنتوں اور ہوس نے نوع انساں کو جس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے مجید امجد نے اُس پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا۔

کون دیکھے گا

جو دن کبھی نہیں بیتا۔وہ دن کب آئے گا
انہی دنوں میں اُس اک دن کو کون دیکھے گا
میں روز ادھر سے گزرتا ہوں ، کون دیکھتا ہے
میں جب ادھر سے نہ گزروں گا ، کون دیکھے گا
ہزار چہرے خود آراء ہیں کون جھانکے گا
مرے نہ ہونے کی ہونی کو کون دیکھے گا(۵)

مجید امجد کی نظموں میں خارجی اور داخلی محرکات میں جو مطابقت پائی جاتی ہے اُس کی بدولت تخلیق اور ابلاغ کو وسعت نصیب ہوئی ہے۔ان کے مطالعے سے قاری وجدان کی مسحور کن کیفیت سے سرشار ہوتا ہے۔ مجید امجد نے اپنے انداز بیاں کے خلوص اور صداقت سے اپنے تجربات و احساسات کو نہایت خوش اسلوبی سے قارئین تک منتقل کر دیا ہے۔ زندگی میں انسان کو بالعموم نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ زمانے کی ناقدری کا شکوہ کرتے ہوئے مجید امجد نے جس دردمندی کے ساتھ حقیقت حال پر روشنی ڈالی ہے۔قاری اُن کے محسوسات کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔اس کے علاوہ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کی مجید امجد نے جو باتیں رقم کی ہیں وہ تو خود بھی اس کے دل پر بھی گزر رہی ہیں گویا وہ اس تجربے میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہی مجید امجد کی نظموں کی اثر آفرینی کا کمال ہے۔

مجید امجد کی زندگی میں اگرچہ تنہائیاں اور دشواریاں ہیں مگر وُہ ان سے دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ ان کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔زندگی میں کامیابی کا تصور ان کے نزدیک یہ ہے کہ انسان جرأت اور عزم کو بروکار لاتے ہوئے سیل زماں کی تند و تیز موجوں سے ٹکرانے پا کمر بستہ ہو جائے ساز گلستاں کو مضراب خار سے چھیڑ کر بھی وہ مطرب کو اس بات پر آمادہ کرتے ہیں کہ بہار کی یاد میں نغمہ سرائی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ عمل چمن زار کی بیداری کے لئے ناگزیر ہے۔اگرچہ وہ ان نغموں کو تعزیت سبزہ زار پر محول کرتے ہیں۔لیکن گزرتے دنوں کی دھند میں یہ روشنی کی کرن ثابت ہو سکتے ہیں۔وہ تنہا اپنے حالات کو نبھاتے رہے اور اس کے بارے میں برملا اظہار بھی کرتے رہے۔

میری مانند خود نگر تنہا
یہ صراحی میں پھول نرگس کا
اتنی شمعیں تھیں تیری یادوں کی
اپنا سایہ بھی ، اپنا سایہ نہ تھا
وقت کی سرحدیں سمٹ جائیں
تیری دوری سے کچھ بعید نہ تھا

امجد ان آنسوؤں کو آگ لگے
کتنا نرم اور گرم ہے یہ دریا(۶)

مجید امجد پینتالیس برس تک لکھنے میں مصروف رہے۔ اس تمام عرصے میں ہیئت کے متعدد تجربے کیے۔ ''طلوعِ فرض'' اور متعدد نظمیں ان کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ عالمی ادبیات کے مطالعہ سے اردو شاعری میں نئی اصناف متعارف کرانے کے بھی تجربے کیے جائیں۔ وہ آزاد نظم میں قوافی کے استعمال سے صوتی آہنگ پر بھی یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف الفاظ اور خیالات پر انحصار کرتے تھے اور ان کے الفاظ اپنی برمحل ساخت اور کیفیات کی بدولت قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ تخلیق کار کی بصیرت اور روح میں موجزن جذبات کا احساس وادراک انہی الفاظ کی بدولت ہوتا ہے۔

تاریخی عمل پر مجید امجد نے بہت توجہ دی۔ تاریخ پر غور کرنا اور اس سے نتائج اخذ کرنا انہیں بہت پسند تھا۔ اس کا سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تاریخی حقائق کے ادراک سے فکر ونظر کو مہمیز کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اذہان کی تطہیر وتنویر کے لیے تاریخی عمل ناگزیر ہے۔ کون ہے جسے اپنے آبادواجداد کے حالات وکمالات سے دلچسپی نہ ہو۔ لیکن تاریخ کا ایک اہم باب جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے جبر کو خلاف جو ردِعمل ظاہر کیا آج اس کا کیا احوال ہے۔ مجید امجد نے روحانی تسکین کیلئے ماضی کے عظیم الشان ورثے پر بھی توجہ دی۔ انہیں اس امر کا احساس تھا کہ معاشرتی اقدار وروایات کو مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ماضی سے آگاہی ضروری ہے۔

مجید امجد نے حریتِ فکر اور جرأتِ اظہار کو اپنی نظموں میں بہت اہمیت دی۔ وہ شعور وذہن کی بالیدگی کے لئے ماضی کے عظیم الشان کارناموں کو لائقِ تقلید سمجھتے تھے۔ دراصل ماضی کی عظیم الشان روایات محض انسانی جرأت اور عزم وہمت کو واقعات نہیں بلکہ ان کے پس پردہ ایک ایسا کائناتی عمل کار فرما ہے۔ جو ہر عہد میں دلوں کو ولولہء تازہ عطا کرتا رہے گا۔ فہم وادراک کے ارتقاء میں تاریخی عمل ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ مجید امجد نے اپنی نظموں میں تاریخی عمل کے حوالے سے ذہنی بیداری کو یقینی بنایا۔

بستے رہے۔۔۔۔۔۔۔
بستے رہے سب تیرے بصرے کونے
اور نیزے پر۔ بازاروں بازاروں گزرا
سر۔۔۔۔۔۔سرور کا
قید میں منزلوں منزلوں روئی
بیٹی ماہِ عرب کی
اور ان میں شاموں کو نخلستان میں گھر گھر، روشن رہے الاؤ
چھینٹے پہنچے، تیری رضا کے ریاضوں تک، خونِ شہدا کے

اور تیری دنیا کے دمشقوں میں بے داغ پھریں زرکا عبائیں!
سلسلے، لہو بھرے طشتوں میں، تھے مقتول گلابوں کے
چہرے فرشتوں پر!
اور ظلموں کے درباروں میں، آہن پوش ضمیروں کے دیدے بے نم
تھے!
مالک، تو ہی اپنے ان شقی جہانوں کے غوغا میں
ہمیں عطا کر۔۔۔۔۔
زیرلب ترتیلیں، ان ناموں کی، جن پر تیرے لبوں کی مہریں ہیں(۷)

مجید امجد کی نظموں میں محبت کا عنصر بھی اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ محبت ہی جو زندگی کی کلفتوں میں شجر سایہ دار بن کر انسان کو آلام روزگار کی تمازت سے محفوظ رکھتی ہے۔ اور زندگی کی حقیقی معنویت کو سامنے لاتی ہے۔ وابستگی اور چاہت کا تصور انسان کو احساس وادراک کی لطافت سے آشنا کرتا ہے۔ اور زندگی میں رنگینی اور رعنائی پیدا ہوتی ہے۔ محبت جب تخلیقی روپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تو اس کے اعجاز سے تخلیق فعالیت کو نیا رنگ اور منفرد آہنگ نصیب ہوتا ہے اور اس طرح تخلیقی قوت کو اظہار کے متعدد نئے مواقع میسر آتے ہیں۔

مجید امجد کی نظموں میں محبت اور ہجر وفراق کا بھی ذکر ملتا ہے۔ محبت کی انانیت اور تنہائی کی کیفیت کا جو انداز مجید امجد کی شاعری میں جلوہ گر ہیوہ ایک منصف مزاج تخلیق کار کے قلبی رجحان کا مظہر ہے۔ وہ نہایت خلوص اور صداقت سے اپنے نصب العین کی وصاحت کرتے ہیں۔ فروغ گلشن وصوت ہزار کا موسم انہیں پسند ہے۔ قہ بہاروں کے تمنائی ہیں مگر بہاریں تو چمن سے روٹھ چکی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ بہاروں کا سوگ منانے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ خزاں کے ہاتھوں میں چمن کا تاراج ہونا، ان کے خیال میں ایک ایسی بدقسمتی ہے جس پر آنکھ اشک بار ہے۔ مجید امجد نے اپنے فکری تجربات، منفرد تصورات اور حقیقت پسندانہ جذبات واحساسات کی آمیزش سے اپنی نظموں کو جہد وعمل کا حسین نمانہ بنادیا ہے۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ اگرچہ ان کی زندگی تلخیوں کی بھینٹ چڑھ گئی مگر آنے والا زمانہ بہتر ماحول کی نوید لائے گا۔ تاہم اس کے لئے سخت محنت اور کٹھن مراحل کو طے کرنے کی لگن ناگزیر ہے۔

مری نگاہ میں دور زماں کی ہر کروٹ
لہو کی لہر، دلوں کا دھواں، گلاب کے پھول
کٹی عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ
مری لحد پہ کھلیں جاوداں گلاب کے پھول(۸)

حوالہ جات